سعادت سعید *

# سر سید احمد خاں کی قومی خدمات کا جوہر

سر سید احمد خاں برصغیر پاک و ہند میں کاروانِ روشن خیالی کے امیر و سالار ہیں۔ انھوں نے مسلم تاریخ میں موجود فکر و عمل کی قوتوں کا جائزہ لے کر جس نظریہ سازی کو بنیادی اہمیت دی اس کی بدولت صدیوں سے موجود توہمات اور غیر سائنسی تصورات کی جھیلوں میں نئے دائرے اور نقوش بننے شروع ہوئے۔ ان کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی نے مسلمانان پاک و ہند کے روایتی تصورات کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا۔ کہنے کو تو سوفسطائیوں سے لے کر معتزلہ تک روشن خیالی کے کئی سلسلے موجود تھے۔ بعد ازاں عہد جدید میں یورپی نشاۃ ثانیہ نے انسانی فکر و خیال کے زاویوں میں تبدیلی کے لیے نمایاں کارنامے سر انجام دیے۔ سر سید احمد خاں نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں اپنی دینی، سماجی، تاریخی، سیاسی، ثقافتی، علمی اور ادبی کتب کے وسیلے سے برصغیر پاک و ہند میں موجود انجمادی فکر کے سلسلوں کو اپنی بصیرت کی حرارت سے نہ صرف پگھلانے کا کام کیا بلکہ ان کی نئی جہت نمائی کے لیے اپنی تمام تر فکری و عملی صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ برصغیر پاک و ہند کی علمی اور فکری تاریخ ان کی ممنون احسان رہے گی۔

وہ اگرچہ مارکسی حوالوں سے ترقی پسند قطعاً نہیں تھے تاہم انھوں نے جس نوع کی روشن خیالی کو متعارف کروایا اس سے بعد ازاں سائنسی فکر کی مشعلیں بہ انداز دگر روشن ہوتی رہیں۔ رومانوی

آئیڈیلزم میں تصورات سازی کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا سراغ بھی ہمیں سرسید کی تحریروں میں مل سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مابعد الطبیعیاتی نظام کی شرح نو کرنے والوں نے بھی ان کے مذہبی حوالوں سے لکھے گئے ادب سے حتی المقدور استفادہ کیا ہے۔ یہ سلسلہ علامہ اقبال سے لے کر جاوید احمد غامدی تک پھیلا ہوا ہے۔ غلام احمد پرویز نے بھی تصور سازی کے لیے روشن خیالی کے اس سرچشمۂ فیض سے اکتساب کیا۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی ہوں کہ مولانا بھاشانی، ان کی سیاسی اور مذہبی بصیرتوں کو سرسید احمد خاں کے تصورات سے کسی نہ کسی حد تک جلا ملی ہے۔ مولانا بھاشانی نے عبیداللہ سندھی کے افکار سے استفادہ کرتے ہوئے روشن خیالی کی اسی رو کو آگے بڑھایا جس نے انسان کی فلاح کے لیے غیر طبقاتی سماج کے تصور کو مثالی قرار دیا۔ تاہم سرسید کے سامنے فوری مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کی کشتی کو لہو رنگ گرداب سے کیسے باہر لائیں۔ سو انھوں نے انتہائی ہنگامی بنیادوں پر، اپنے علمی و ادبی تصورات کے وسیلے سے اس کشتی کو ہموار دریا کی روانی دی۔ یوں برصغیر پاک و ہند کے انگریزوں کے نزدیک گردن زدنی ''آزادی پسند'' یا ''باغی'' مسلمانوں کو ان کے اپنے علاقے میں نشو و نما کے مواقع میسر آئے۔ حتیٰ کہ انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کے مابین متوازی فاصلوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس امر کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ یہ دونوں قومیں یکجا نہیں ہوسکتیں۔ اس حوالے سے قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی اپنے آخری دور میں کانگرس کو خیر باد کہہ کر مسلمانوں کی قیادت کرنی پڑی۔ بعد ازاں انھیں بھی تقسیم بنگال کی منطق سمجھنے میں آسانی ہوئی، یوں وہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔



سرسید احمد کی حیات کو اگر ''حیات جاوید'' کا نام دیا گیا ہے تو اس کو حقیقت قرار دینا ہمارے لیے باعث فخر ہے کہ اس دور میں موجود روشن خیال مسلمان ان کے گن گا رہے ہیں اور جب تک دنیا میں روشن خیالی کو اہمیت حاصل رہے گی سرسید احمد خاں کی حیات جاودانی عظمت کی علامت بنی رہے گی۔

سرسید احمد خاں نے اپنی تقریروں، مقالوں، مضمونوں اور متنوع موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کے وسیلے سے اس امر کی عملی تعبیر پیش کی کہ معاشرتی رہنمائی کے لیے لکھنے والا ادیب سماجی عمل کا نقیب

ہوتا ہے۔ اس کے سامنے جس نوع کا ہنگامی مقصد ہوتا ہے اس میں اس کی توجہ فنی بالیدگیوں، تکنیکی موشگافیوں اور قواعدی منطقوں کی جانب مبذول نہیں ہوسکتی کہ اسے تو اپنی بصیرت کو واضح طور پر ملک و ملت کے لوگوں تک پہنچانے کے لیے ابلاغ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یعنی ابلاغ کو ہی بنیادی تقاضا بنا کر کوئی رہنما اپنے تصورات کو عام فہم انداز سے اپنی اصلاح کے طالب عوام تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ سر سید احمد خاں نے اس فریضے کو عمدگی سے ادا کیا اور اپنے ادب وفن کو بے جا دور از کار تخیلات اور عالمانہ موشگافیوں سے قدرے دور ہی رکھا۔ البتہ کئی مابعد الطبیعیاتی فکری وتصوراتی سلسلوں کو سائنسی پیچ داری کے قریب لانے کے لیے انھیں جوازی اور علتی ومعلولی سلاسل کی جانب رجوع کرنا پڑا۔ ان کے ان حوالوں پر بہت لے دے بھی ہوئی لیکن بالآخر اونٹ اس کروٹ بیٹھا کہ معاشرے میں بڑے پیمانے پر سائنسی نفسیات کو فروغ ملا اور یوں ہر کس و ناکس غیر سائنسی تصورات کو تسلیم کرنے کے لیے سائنسی جواز بازی میں عافیت محسوس کرنے لگا۔

سر سید احمد خاں نے اپنے علم و ادب کو مسلم معاشرے میں نئی طرز کے سماجی انقلاب کی نشوونما اور فروغ کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے اپنے رفقا اور معاصر ادیبوں سے اس امر کا مطالبہ کیا کہ وہ بھی نئے علوم کے اکتساب کی اہمیت پر زور دے کر اپنے علم و ادب کو سماجی انقلاب کے لیے استعمال کریں۔ اس بات پر ان کے کئی رفقا محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کی سنگ باریوں کی زد میں بھی آئے۔ مثلاً محمد حسن عسکری نے مولانا حالی کی ''پیروی مغربی'' کو شدید طنز کا نشانہ بنایا اور ساتھ ہی ان کے ''مفلر اور رومال'' کو موضوع بنا کر ان کے جدید تصورات کی نفی کی۔ ان سے قبل سر سید احمد خاں کی فکر کو اکبر الہ آبادی بھی شدید طنز کا نشانہ بنا چکے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد بھی ابن الوقت کا قضیہ چھیڑ چکے تھے۔ لیکن مولانا حالی استقامت کے ساتھ سر سید احمد کی بنائی ہوئی ڈگر پر بخوشی گامزن رہے اور یوں فرحت اللہ بیگ جیسے ''صاحب بہادر'' کو بھی اپنی فکر کی ناکامی پر خفت اٹھانی پڑی۔ سبب اس امر کا صرف اتنا ہے کہ سر سید احمد خاں کی فکر عصری اور زمانی تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی کی مسدس کو سر سید نے اپنی نجات کا ذریعہ قرار دے کر ان کی ملت دوستی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد کی اصلاحی شاعری سے اردو ادب میں

جدید ترین شاعری کی راہ ہموار ہو سکی۔ یہی نہیں انھوں نے جس نوع کی اصلاحی تنقید کو فروغ دیا وہ اس مغربی روشن خیال فکر کے کارواں کے حوالے ہی سے تھی جس کے اولین سالاروں میں سرسید احمد خاں کا نام سرفہرست ہے۔

سرسید احمد خاں پر بعض ترقی پسند نقادوں کی طرف سے یہ بھی اعتراض ہوا کہ انھوں نے انگلستانی سامراجیت کو دل و جان سے قبول کر رکھا تھا۔ وہ برطانوی مقاصد کو فروغ دینے سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس سے انکار ممکن نہیں ہے تاہم اس دور کے حالات کے مطابق جس نوع کی دانش مسلمانوں کے لیے ضروری تھی اس پر انھوں نے زور دیا۔ یہ درست ہے کہ کوئی بھی آزادی پسند، سامراج اور اس کے بچھائے جالوں کو مضبوط کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ سرسید ہندوستان پر انگلستانی قبضے سے پورے طور پر آگاہ تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی کو کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں ناسازگار زمانہ آ گیا ہے اس لیے انھوں نے اس کی نزاکتوں کو سمجھ کر ان کی درست جہت نمائی کا فریضہ ادا کیا۔

سرسید احمد خاں ہماری علمی تاریخ کی وہ منفرد شخصیت ہیں جنھوں نے اپنے تاریخی مطالعوں سے وہ قابل عمل سبق سیکھے کہ جن کی مدد سے وہ عصری تقاضوں کا ساتھ دینے کے اہل ہوئے۔ تیموری تاریخ ہو یا قدیم ہندی تاریخ، فیروز شاہی تاریخ ہو یا عجمی عربی۔ ان کے مطالعوں نے انھیں یہ باور کروایا کہ دنیا میں کچلی ہوئی اور زوال پذیر قوموں کے سکے نہیں چلا کرتے۔ علاوہ ازیں حکمران کتنے ہی عالیشان کیوں نہ ہوں ان کی جگہ لینے والے متواتر آتے رہتے ہیں۔ یعنی نہ گور سکندر ہی رہتی ہے اور نہ قصر دارا، نامی کسی بھی سطح کے کیوں نہ ہوں ان کے نشان مٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسے میں وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے خلعتیں پانے کے باوجود اگر انھیں اپنی یاد کا حصہ بنا کر نئے فاتحین سے اپنے تعلقات بگاڑ لیتے تو یہ کوئی دانش مندی کی بات نہ تھی۔

سرسید احمد خاں نے تاریخ سے یہ سبق سیکھا تھا کہ جو پتے برباد ہوئے ان کا تعاقب کرنا کار لاحاصل ہے۔ سو انھوں نے ہوا کے رخ اور تاریخ کے منشا کو بخوبی سمجھ کر اپنا لائحہ عمل تیار کیا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل لکھی گئیں ان کی کتابیں مقامی شاہوں اور ان کے کارناموں سے اگر متعلق تھیں بھی، بعد ازاں

انھوں نے ان کی یاد کو اپنے سینے سے نکالنے میں پس و پیش سے کام نہ لیا۔ آثار الصنادید ہو یا جامِ جــــم (۱۸۴۰ء)، اس میں مغل سلطنت کے بانی امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ کا ۱۸۴۰ء تک کا حال مندرج ہے۔ سر سید کی کتاب سلسلة الملوك (۱۸۵۲ء) میں راجہ یدھشٹر سے ۱۸۵۲ء تک کے دہلوی حکمرانوں کی تاریخ رقم ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں تصحیح آئین اکبری ہو یا تصحیح تاریخ فیروز شاہی (مصنفہ ضیاء الدین برنی) سب نے ان کے دماغ میں ایک بات ضرور راسخ کر دی تھی کہ حکمران کسی بھی دور کا کیوں نہ ہو اس کی اطاعت کے بغیر امور سلطنت خلل پذیر رہتے ہیں۔

اگر سر سید احمد مسلمانوں کے اقتدار کے چھن جانے کا غم مناتے رہتے اور اپنے اندر ہندوستانی جہاز کو ڈبونے والی ''سفید وہیل'' کے خلاف نفرت، انتقام اور غصے کا لاوا جمع کرتے رہتے تو وہ منصوبے جن پر عمل کر کے بعد ازاں اس ''سفید وہیل'' سے نجات کی سبیلیں سامنے آئیں، پردۂ غیب ہی میں مستور رہتے۔ جنگ آزادی سے زخم خوردہ یہ ''وہیل'' مسلمانوں کی مکمل تباہی پر بھی آمادہ ہو سکتی تھی لیکن اس کے زخم بھرنے کے لیے سر سید جیسے دانش مند آدمی ہی کی ضرورت تھی۔ یہ کام انھوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا اور پھر بھولے سے بھی کبھی اپنے پرزے پرزے جہاز کی طرف توجہ نہیں کی۔ اگر وہ گردش ایام کو پیچھے کی طرف لوٹانے کا فوری نعرہ بلند کرتے تو آج ہم آزاد فضاؤں میں سانس نہ لے رہے ہوتے۔ بلکہ گمان غالب تھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو سپین کی طرح دیس نکالا دے دیا جاتا اور یہ علاقہ مسلمانوں سے چھین لیا جاتا۔

پرانی تاریخیں یہ سبق بھی سکھاتی ہیں کہ ان غلطیوں سے اجتناب کیا جائے جو کسی شاہ یا قوم کی بربادی کا باعث بنتی ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن سر سید احمد خاں کو ہندوستانی تاریخ کے نئے آئین کی طرف توجہ دلانے والے مرزا غالب ہی تھے کہ انھوں نے تصحیح آئین اکبری کی منظوم تقریظ لکھتے ہوئے لکھا ''مردہ پروردن مبارک کار نیست''[۱]۔ یہ تجزیہ چاہے اس وقت سر سید کو پسند نہ آیا ہو لیکن بعد ازاں اسی اشارے کو سمجھ کر انھوں نے انگریزی آئین کی رطب اللسانی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ مرزا غالب نے سر سید پر واضح کر دیا تھا کہ میں سیدوں کا غلام ہوں مگر یہ زمانہ پرانے شاہی آئینوں کی پذیرائی کا نہیں ہے۔ نئے انگریزی آئین اور طور طریقوں کی بدولت انگریزوں نے جو

سائنسی اور علمی ترقی کی منزلیں ماری ہیں، عہد حاضر کے دانشوروں اور انسانوں کو ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔ یہ تقریظ اگرچہ سرسید نے طبع نہیں کروائی لیکن اس کا ایک ایک حرف ان کے دماغ پر نقش ہو گیا تھا۔ سو انھوں نے انگریزی علمی ترقیوں کی شان میں صدق دل سے بہت کچھ لکھا۔ ویسے تو تسہیل فی جرالثقیل جیسی کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن ۱۸۵۷ء سے قبل بھی سائنسی علوم کی جانب مائل ہونے لگا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے ''قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین'' اور ''فوائد الافکار فی اعمال الفرجار'' ترجمہ ۱۸۶۴ء جیسے سائنسی مقالے بھی قلم بند کیے۔ مرزا غالب لکھتے ہیں:

مژده یاراں را کہ ایں دیریں کتاب
یافت از اقبال سید فتحِ باب
دیده بینا آمد و باز و قوی
کہنگی پوشید تشریف نوی
وینکہ در تصحیح آئیں رائے اوست
ننگ و عار ہمت والائے اوست[۲]

..................

ہر خوشے را خوشترے ہم بوده است
گر سرے ہست افسرے ہم بوده است
مرده پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست
غالب آئین خموشی دلکش است
گرچہ خوش گفتی نگفتن ہم خوش است[۳]

برصغیر پاک و ہند میں موجود تاریخ تصوف و ادب میں ملّا اور صوفی کے مابین نزاع کی حکایات نئی نہیں ہیں۔ شاہ حسین، حضرت سلطان باہو، وارث شاہ، بلھے شاہ، میاں میر، میاں محمد اور بہت سے دوسرے پنجابی شعرا نے اس نزاع کو کھل کر بیان کیا ہے۔ یہ روایت اردو میں محتسب اور صوفی کے نزاع کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ ان سے قبل فارسی میں حافظ جیسے شعرا نے اس سلسلے میں شرع اور تصوف کے معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھایا تھا۔ نئے عہد میں ملّا کے خلاف اقبال اور واعظ کے

خلاف فیض کے کلام میں متنوع اشعار دستیاب ہیں۔فیض نے تو انا الحق کا نعرہ نئی سامراجی صورت حال کے پس منظر میں لگا کر منصور حلاج، بایزید بسطامی اور سرمد شہید کی یاد تازہ کر دی۔ برصغیر میں ابن عربی کے تصوف پر ملاؤں یا ملا نما عالموں نے جو اعتراضات کیے انھیں خلقِ خدا نے بڑے پیمانے پر رد کیا اور وحدت الشہود کے مقابلے میں وحدت الوجود کی منطق کو اپنانے میں عافیت محسوس کی۔ اس منطق نے جہاں طبقاتی نظام کے خلاف شدید ردعمل کی صورت اختیار کر لی وہاں مفاد پرستی کے تحت جنم لینے والے عقائد کی رجعتی جبریت کو بھی خاطر میں لانے سے گریز کیا۔ چنانچہ اس منطق کے نتیجے میں قبلہ کو قبلہ نما سمجھا گیا اور مطلوب حقیقی کو سرحد ادراک سے ورا قرار دیا گیا۔ یوں تصوف کی راہ سے در آنے والی دانش روشن خیالی کے اوصاف سے مزین نظر آنے لگی۔ انگریزی عہد میں روشن خیالی سائنسی بنیادوں پر استوار ہوئی، یوں علم تصوف کی بجائے سائنسی اور مادی تصورات کی دنیا میں داخل ہو گیا۔ قدیم علوم کی مابعد الطبیعیات کو جدید تجرباتی عقلی علوم نے چیلنج کرنا شروع کیا۔ جس کے نتیجے میں اکبرالہ آبادی نے سرسید احمد جیسے روشن خیال عالم پر کڑی تنقید کا علم بلند کیا۔لیکن وہ استقرائی یا سائنسی علوم کے رستے کی دیوار نہ بن سکے۔ سرسید احمد خاں نے جس نوع کی روشن خیالی کے در وا کیے اس پر ملاؤں اور لکیری فقیری دانشوروں نے حسب مقدور تنقیدی وار کیے مگر روشن خیالی کو پھیلنا تھا اور وہ پھیل کر رہی۔ سرسید کو محسوس ہوا کہ جدید مغربی علمی یلغار مقامی نوجوانوں کو مذہب سے بیزار کر رہی ہے، انھیں واپس اس دائرے میں لانے کے لیے مذہب کی روشن خیالی پر مبنی تعبیروں کی ضرورت ہے اور یہ کام ان کے بعد ایک نئے سلیقے سے علامہ محمد اقبال نے اپنے انگریزی خطبات میں کیا۔ یہ خطبات ایک فلسفی کے خطبات تھے جن میں کئی نازک مذہبی معاملات کو عقلی حوالوں سے پرکھا گیا۔ انھوں نے وجدان اور الہام جیسی پُراسرار قوتوں کو حس اور حسیت کی اعلیٰ شکلوں کا نام دے دیا۔ یہاں تک کہ کئی ایسے مذہبی سلسلوں کو جو مقامات کی صورت دیکھے جاتے تھے، حالتوں سے عبارت ٹھہرایا۔ اسی نوع کے بے شمار حوالے خطبات اقبال کی زینت بنے ہیں۔لیکن علامہ اقبال سے قبل جس عالم یا دانشور نے سائنسی اور عقلی حوالوں سے مذہبی تصورات کی تعبیر کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا وہ تھے سرسید احمد خاں!

علامہ اقبال نے سرسید احمد خاں کے حوالے سے جو نظم لکھی ہے اس میں کہا گیا ہے :

## سید کی لوحِ تربت



اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اجڑا ہوا تھا، اس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی
سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ
مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
محفلِ نَو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اَب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ
تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے
ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم

پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمَنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے[۴]

سر سید احمد خاں ہندوستان کے مسلمانوں کو جس منزل کی طرف لے جانا چاہتے تھے وہ ایسے نئے علوم کی منزل تھی جو آگے چل کر مسلمانوں کے کام آنے والی تھی۔ چنانچہ کلمہ طیبہ کے حوالے سے انھوں نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ یہ عروۃ الوثقی اور حبل الورید ہے۔ اس مضبوط رسی کے رشتے میں بندھ کر اپنے آپ کو مستحکم کرو اور یوں دنیا بھر میں انما المؤمنون اخوۃ کی مثال بن جاؤ۔ علامہ اقبال نے بھی جب ملت اسلامیہ کو ایک لڑی میں پرونے کا خواب دیکھا تھا تو انھوں نے بھی کلمہ طیبہ یعنی لا الہ اللہ محمد رسول اللہ کے حوالے سے مسلمانوں کے سامنے ایسے تصورات پیش کیے، جن کی بدولت وہ متحد ہو کر اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکتے تھے۔ سر سید احمد خاں کی فکر کے اثرات ہمیں آزاد نظم کے عظیم ترین شاعر ن م راشد کے ہاں بھی نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> بچپن میں والدہ نے قلم پکڑنا سکھایا۔ وہ اکثر والد کے ساتھ ان کی ملازمت کے مقام پر رہتیں، لیکن جب کبھی وطن واپس آتیں خاص طور پر گرمی کی چھٹیوں میں تو مجھے کہانیاں سنایا کرتیں۔ خاص طور پر پیغمبروں اور اولیاء اللہ کی کہانیاں جو میں نے کئی کئی بار سنیں۔ دادی کو الف لیلیٰ اور چار درویش وغیرہ شروع سے آخر تک یاد تھیں۔ ان سے ان سب کتابوں کی کہانیاں بچپن ہی میں سننا نصیب ہوا۔ ایک چچا پٹواری تھے، انھوں نے کئی راتوں میں مجھے انوار سہیلی (فارسی میں) اردو ترجمے کے ساتھ سنا ڈالی۔ جب ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء میں دادا پنشن لے کر گھر آئے تو انھوں نے عربی کی چار ریڈریں اور صرف و نحو مجھے اور میری والدہ کو ایک ساتھ پڑھائی اور اس کے بعد کئی برس تک قرآن مجید ترجمے کے ساتھ پڑھایا۔ خود دادا اپنے ساتھ عربی اور فارسی کے بڑے بڑے پلندے لائے تھے۔ ان میں سے بیشتر کتابیں فقہ، تفسیر اور حدیث کی تھیں، لیکن کچھ عربی فارسی اور اردو شاعروں کے دیوان بھی تھے۔ دادا کا بیشتر وقت شروع شروع میں اردو مسدس یوسف زلیخا لکھنے پر گذرتا تھا، جسے انھوں نے کئی برس سے لکھنا شروع کر رکھا تھا۔ بعد میں انھوں نے اپنی توجہ قرآن مجید کی تفسیر اور منطق

انداز میں آیات کریمہ کی تشریح پر صرف کی ہے۔ وہ فرشتوں اور جنات اور معجزوں اور کرامات کے قائل نہ تھے۔ فرشتے ان کے نزدیک محض طاقتیں ہیں جنھیں انسان کی خدمت کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ جنات شریر انسان ہیں اور انسانوں سے الگ کوئی غائب مخلوق نہیں ہیں۔ معجزے اور کرامات محض استعارے ہیں اور اکثر مقامات پر مفسروں نے عربی سے ناواقفیت کے باعث سیدھے سادے مطلب کو معجزے اور کرامات کا رنگ پہنا لیا ہے۔ قرآن کہانیوں کی کتاب نہیں، قانون اور اخلاق کی کتاب ہے۔ حروف مقطعات مخففات نہیں ہیں، نہ ان میں کوئی خفیہ اشارہ پایا جاتا ہے...... میرے خیال میں دادا اس تفسیر میں سرسید اور ان کے رفقا کے خیالات سے بے حد متاثر تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے وہ اپنی جدت اور ابتکار میں ان سے بھی دو قدم آگے نکل گئے ہیں، جس سے ان کے انفرادی غور و فکر کا پتہ چلتا ہے۔ انفرادی غور و فکر پر وہ ہمیشہ بہت زور دیا کرتے تھے اور ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ کسی چیز کو اس کی سطحی قیمت پر قبول نہ کرو بلکہ اس کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش کرو، پھر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرو۔ میں ان کے مذہبی خیالات کے بارے میں اکثر ان سے بحث مباحثہ کیا کرتا تھا۔ ان کی حوصلہ افزائی سے میرے خیالات اس وقت بھی بچپن کی ناپختگی کے باوجود ان کے اپنے فلسفے کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتے تھے، یعنی میں ان کی تردید نہیں کرتا تھا بلکہ انھی کے خیالات کو کم رس ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مثلاً اگر فرشتے نہیں ہیں تو خدا کیوں ہے؟ اور اگر خدا ہے تو فرشتے کیوں نہیں ہو سکتے ؟ جہاں تک معجزوں کا تعلق ہے ہوسکتا ہے کہ پیغمبروں کے پاس موجودہ سائنس کا سب علم ہو، جس سے عامتہ الناس اس وقت بھی بے بہرہ تھے جتنے آج ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ پیغمبر ہوں ہی اس زمانے کے سائنسدان اور اسی وجہ سے عام لوگوں میں ممتاز ہوں اور وہ سائنس کے حسابی طریقوں سے انسان کی فلاح و بہبود کا راز جانتے ہوں اور لوگ ان کے کاموں کو اتنا ہی محیر العقول سمجھتے ہوں جتنا آج ریل گاڑی اور سائنس کی ایجادوں کو سمجھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح خیر و شر اور جسم و روح اور تقدیر و تدبیر کے مسائل پر بھی ان سے اکثر بحث میں الجھ جایا کرتا تھا اور ان کے خیالات کے بعض تناقضات ان پر روشن کر کے دم لیا کرتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ میری ان باتوں پر کبھی ناراضی ظاہر نہیں کرتے تھے بلکہ میری باتیں سن کر گھنٹوں غور و فکر میں مبتلا رہتے اور

بعض اعتراضات کو خندہ پیشانی سے قبول بھی کر لیا کرتے تھے۔[۵]

سر سید احمد خاں کے فکری ذہن نے کئی معاملات میں اختراعی اپج سے کام لیا تھا، اس لیے ان کی تقلید میں فکر و فلسفہ کی ترویج و اشاعت کرنے والے بعض اصحاب ان سے دو ہاتھ آگے نکلتے دکھائی دیے۔ ن م راشد کے اختراعی ذہن نے ملائے حزیں کو تین سو سال کی ذلت کا نشان قرار دے کر خدا کے انجام پر رطب اللسانی کرنے کا کام بھی کیا۔ گو اس حوالے سے نٹشے کے تصورات عالمی سطح پر دانشوروں کو چونکا چکے تھے۔ سر سید احمد خاں راشد کی طرح مذہبی دائرے سے باہر نکل کر بات کرتے تو شاید ہندوستان میں انھیں اپنا کوئی مقلد یا موید نصیب نہ ہوتا۔ انھوں نے مذہب کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے جس نوع کی روشن خیالی کو قبول کیا وہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسی نئی ڈگر پر لے آئی جو انھیں سائنسی اور عقلی منزلوں کی جانب لے جانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر صدیق جاوید ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کے (چار) دوروں کے بعد سر سید احمد خاں کی مقبولیت کے بارے میں کہتے ہیں:

> ان مواقع پر عوام و خواص سے شخصی رابطوں اور استقبالیہ تقریبات میں سرسید کی تقاریر اور بیانات نے پنجاب کے مسلمانوں میں قومی اور ملی شعور کی آبیاری کی۔ یہاں جدید تعلیم کی افادیت کا احساس تو پہلے سے انفرادی سطح پر موجود تھا۔ مگر سرسید کے دوروں نے جدید تعلیم کے حصول کو بڑی حد تک اجتماعی احساس میں بدل دیا۔ خود سرسید کے لیے یہ دورے حوصلہ افزا ثابت ہوئے۔ پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں: خود (سرسید کے) اپنے صوبے کی آبادی کے سواد اعظم نے ان سے جو سلوک روا رکھا تھا، اس کے برعکس اہل پنجاب کی طرف سے پر جوش خیر مقدم نے سرسید کے لیے تقدیر کی بازی کا رخ پلٹ دیا۔ پنجاب کے مسلمانوں نے سرسید کا قومی پیغام اس برجستگی سے کیوں قبول کر لیا؟'' اس کی تشریح مولانا حالی نے حیات جاوید میں بالفاظ ذیل کی ہے: ''پنجاب کے مسلمان، جنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی اور اس لیے انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کو خیر مقدم کہنے کے لیے تیار بیٹھے تھے، سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے ...... سچ یہ ہے کہ سرسید اور ان کے کاموں کی کسی صوبے نے عام طور پر ایسی قدر

> نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی...... سرسید کی ہر قسم کی اصلاحیں انھوں نے سب سے زیادہ قبول کیں اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر انھوں نے سرسید کی تقلید اختیار کی۔ یہاں تک کہ ان کو ''زندہ دلان پنجاب'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا...... سرسید کے پہلے سفر پنجاب سے قبل پنجاب کے بعض سماجی اور مذہبی شعور رکھنے والے درد مند بزرگوں کے دل میں مسلمانوں کی حالت کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ انھوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی سماجی، مذہبی اور تعلیمی زندگی کی اصلاح کے لیے انجمنیں قائم کیں۔[۶]

سرسید احمد خاں کے غیر مقلد ذہن نے مذہب و مسالک کی نئی جہتیں دریافت کرنے کے لیے تحفۂ حسن (۱۸۴۴ء)، کلمة الحق (۱۸۴۹ء)، راہِ سنت و ردِ بدعت (۱۸۵۰ء)، نمیقه در بیانِ مسئله تصورِ شیخ (۱۸۵۲ء)، سیرت فریدیه (اپنے نانا کی حیات وسیرت کے بارے میں)، تحقیق لفظ نصاری، تبئین الکلام (۱۸۶۲ء)، احکامِ طعام اہلِ کتاب، خطبات احمدیه (۱۸۷۰ء)، رساله در ابطالِ غلامی، تفسیر القرآن، النظر فی بعض المسائل، جواب امہات المومنین جیسی مذہبی کتب بھی تحریر کیں۔ ان میں موجود خیالات ان کے مذہبی اور دینی مقالات میں بھی دستیاب ہیں۔ مذہبی معاملات کی نئی تعبیروں کا اگلا مرحلہ علامہ اقبال کے حصے میں آیا جنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں مذہبی معاملات کو استقرائی یا تجرباتی فکر سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ علامہ اقبال کی سرسید احمد کے حوالے سے لکھی گئی نظم سرسید احمد خاں کی مذہبی خدمات کے جوہر یعنی سائنسی حوالوں کی بھی وضاحت کرتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کا خیال ہے:

> دنیاے اسلام میں یورپی استعماری طاقتوں کی آمد کے ساتھ ساتھ جو نئے خیالات وارد ہوئے، اُن کے بارے میں مسلمانوں کا ردعمل تین طرح کا تھا: یا تو مکمل استرداد، یا مکمل قبولیت، یا انھیں اسلامی تصورات سے ہم آہنگ کرنا۔ مغربی خیالات کو مکمل طور پر رد کرنے والے مسلمان زیادہ تر مذہبی انتہا پسند تھے جن کو ''وہابی'' کہا جاتا تھا یا ان کو ''رجعت پسند'' خیال کیا جاتا تھا۔ تعاون کرنے والے مسلمانوں کو ''مغرب زدہ'' کہا جاتا تھا۔ نئے خیالات کی اسلام سے ہم آہنگی پیدا کرنے والوں کو ''آزاد خیال مصلحین'' کہا جانے لگا۔ ان کو رجعت پسند یا قدامت پسند، جو مغربیت اور جدیدیت

> میں امتیاز نہیں کرتے تھے، مغرب زدہ مسلمان خیال کرتے تھے۔ رجعت پسندوں کی مزاحمت دنیاے اسلام میں یورپی استعماری طاقتوں کی پیش رفت کو نہ روک سکی، کیونکہ انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ مغرب کی طاقت کے سرچشمے کیا ہیں، جن میں انسانی علم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے سرچشمے شامل ہیں۔ ہندوستان میں انھوں نے انگریزوں کا مقابلہ پرانی وضع کی بندوقوں یا تلواروں سے کیا، جب کہ انگریزوں نے دُور مار توپوں سے کام لیا۔ چنانچہ ان کو شکست ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ انگریزوں نے ۱۸۵۸ء تا ۱۸۷۰ء کے فقط بارہ برسوں میں ہندوستان کی پوری مسلم قوم کو کچل کر رکھ دیا۔ انگریزوں نے اپنی جارحیت کی پالیسی کو ۱۸۷۰ء میں تبدیل کیا۔ اُن کے جارحانہ رویے میں یہ تبدیلی زیادہ تر سرسیّد احمد خاں (۱۸۱۷ء – ۱۸۹۸ء) کی کوششوں سے ہوئی، جن کو ہندوستان میں انگریز حکومت اور مابعد بغاوت مسلمانوں کے درمیان داعی امن و مفاہمت قرار دیا جاتا ہے۔ مرے ٹی ٹائٹس نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''سرسیّد نے اپنے لوگوں کی طرف حکمران طاقت کی ہمدردی یہ ظاہر کرکے حاصل کی کہ وہ تو انگریزی حکومت کے وفادار ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بڑی مستعدی اور محنت سے مسلمانوں کو زندگی کے نئے رویے کی طرف لانے کی کوشش کی، جس کے بارے میں انھیں یقین تھا کہ صرف یہی رویہ اختیار کرنے سے مکمل تباہی سے بچا جاسکتا ہے۔'' غدر سے پہلے کا سرسیّد کا کیریئر اتنا اہم نہیں ہے، جتنا غدر کے بعد کی سرگرمیاں اہم ہیں۔[۷]

سرسید احمد خاں کی قومی خدمات کا جوہر یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں اور عملی کاموں کی مدد سے کمال خوش اسلوبی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کے دور ادبار سے نکالنے کی مساعی کی۔ ان کا رسالہ در ابطال غلامی اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ انسان کے بنیادی حق آزادی اور حق رائے کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر آنے والے مشکل حالات کے تناظر میں لائحۂ عمل تجویز کرنے کے حق میں تھے۔ ان کی انگریز دوستی کو تقیہ کہہ لیں یا دروغ مصلحت آمیز، ایک پہلو کہ انھوں نے بہ ہر رنگ قومی خدمت کے شعار کا علم بلند رکھا۔ اگر انھوں نے انگریزی نظام حکومت کو قبول کیا تو یہ ان کی دانشمندی تھی کہ اس راہ سے ہو کر وہ مسلمانوں کے لیے سماجی حقوق، تعلیمی مراعات اور ملازمتوں کی تحصیل کے مواقع پیدا کروا سکے۔ مزید برآں ان کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کے عظیم رفقا نے اپنی

علمی کاوشوں کے وسیلے سے مسلمانان ہند کے لیے ایسے ماحول کی بنیادیں استوار کیں جس میں ان کے لیے انگریزوں کے سنگی ساتھی مقامی برہمنوں سے ہر میدان میں مقابلہ کرنا آسان ہو گیا۔ اگر سر سید اور ان کے رفقائے کار کی یہ مساعی نہ ہوتی تو علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی وہ ماحول میسر نہ آتا جس کے دائرۂ کار میں رہ کر وہ مسلمانان ہند کی آزادی کے خواب دیکھ پائے۔

## حواشی وحوالے

* پروفیسر و سابق صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور۔

۱۔ ضیاء الحسن فاروقی، بحوالہ مضمون ''تقریظ آئین اکبری''، جامعہ غالب نمبر، جلد ۵۹، شمارہ ۲۔۳ (فروری و مارچ ۱۹۶۹ء)، ص ۱۱۴۔۱۱۵۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۵۔

اس تقریظ کا ایک ترجمہ راقم الحروف نے بھی کیا تھا جو راوی غالب نمبر (۱۹۹۷ء) میں شائع ہوا تھا۔

۴۔ محمد اقبال، ''بانگ درا''، کلیات اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۴ء)، ص ۸۴۔

۵۔ سعادت سعید و نسرین انجم بھٹی، راشد بقلم خود (لاہور: شعبۂ اردو، جی سی یونی ورسٹی، ۲۰۱۰ء)، ص ۳۷۔

۶۔ صدیق جاوید، فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء)، ص ۳۴۔۳۵۔

۷۔ جاوید اقبال، اسلام اور پاکستانی تشخص، ترجمہ سیّد قاسم محمود (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۸)، ص ۱۶۴۔۱۶۵۔

نوٹ: سر سید احمد خاں کی کتب کے نام مقالات سید جلد اول، مرتبہ مولانا اسمٰعیل پانی پتی سے لیے گئے ہیں۔ ان کے مقالات کی کئی جلدیں مجلس ترقی ادب لاہور نے مختلف سالوں میں شائع کی ہیں۔ سر سید کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ کی معرکۃ الآرا کتاب سر سید اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری و فنی جائزہ مطبوعہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ملاحظہ ہو۔



## مآخذ

اقبال، جاوید۔ اسلام اور پاکستانی تشخص۔ ترجمہ سیّد قاسم محمود۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۸۔

اقبال، محمد۔ ''بانگ درا''۔ کلیات اقبال اردو۔ لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۴ء۔

جاوید، صدیق۔ فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء۔

سعید، سعادت و نسرین انجم بھٹی۔ راشد بقلم خود۔ لاہور: شعبۂ اردو، جی سی یونی ورسٹی، ۲۰۱۰ء۔

فاروقی، ضیاء الحسن۔ بحوالہ مضمون ''تقریظ آئین اکبری''۔ جامعہ غالب نمبر، جلد ۵۹، شمارہ ۲۔۳ (فروری و مارچ ۱۹۶۹ء)۔